مشق اور مطالعہ

(1) "فسانۂ آزاد" کا خلاصہ کئی بار چھپ چکا ہے۔ اگر آپ کی لائبریری میں دستیاب ہو تو اس کے کچھ حصّے پڑھیے۔

(2) مہری کا سراپا اس کی خوب صورتی کو زیادہ ظاہر کرتا ہے یا اس کے بناؤ سنگار کو؟ خوب صورتی اور بناؤ سنگار کو ظاہر کرنے والے فقرے الگ الگ لکھیے اور بتائیے کہ کون سے فقرے ایسے ہیں جن سے دونوں باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔

شِبلی نُعمانی

(1857 – 1914)

شِبلی اعظم گڑھ کے ایک خوش حال گھرانے میں پیدا ہوئے۔ 1884 میں انھوں نے علی گڑھ کالج کے شعبۂ عربی فارسی میں ملازمت اختیار کرلی۔ یہاں انھوں نے سرسیّد اور کالج کے انگریز پرنسپل آرنلڈ کے زیرِ اثر نئے خیالات سے آگاہی حاصل کی۔ سرسیّد کی صحبت نے شبلی کے جوہرِ قابل کو اور بھی چمکا دیا۔

علی گڑھ میں کئی سال رہنے کے بعد شبلی نے کچھ دن ریاست حیدر آباد کے "دارالتّرجمہ" میں کام کیا۔ پھر انھوں نے لکھنؤ میں "نَدوَۃ العُلما" کے نام سے ایک اعلا درس گاہ قائم کی۔ یہ درس گاہ بہت کام یاب ہوئی اور اب بھی اپنی پوری شان کے ساتھ باقی ہے۔ ندوے سے الگ ہوکر شبلی نے اپنے وطن اعظم گڑھ میں "دارالمصنّفین" کی بنیاد ڈالی۔ یہ ایک علمی اور تحقیقی ادارہ ہے جو اب بھی موجود اور اپنے کام میں مصروف ہے۔

انّیسویں صدی کے آخری پچّیس برسوں میں اردو علم و ادب کے میدان میں کئی غیر معمولی لوگ نمایاں ہوئے۔ ان میں سے بعض مثلاً سرسیّد احمد، محمد حُسین آزاد، الطاف حسین حالی اور نذیر احمد سے آپ واقف ہیں۔ شبلی ان سب سے بعد میں پیدا ہوئے اور انھوں نے ان سب سے کم عمر بھی پائی۔

لیکن کارناموں کی ہمہ گیری کے اعتبار سے شبلی غالباً ان سب سے بڑھ کر ہیں۔ اس پورے گروہ میں سرسید سب سے بڑے آدمی تھے، لیکن شبلی نے سرسید سے بھی زیادہ متنوّع میدانوں میں اپنے نقوش چھوڑے۔ فارسی ادب، فارسی شاعری، اردو شاعری، تنقید، تاریخِ ادب، فلسفہ، تاریخ، تعلیم، مذہب، سیاست کون سا شعبہ ایسا ہے جس میں شبلی نے قابل قدر بلکہ اپنے معاصروں اور پیش رووں سے بہتر کام نہ کیے ہوں ؟

جدید اردو ادب اور تنقید پر شبلی نے گہرا اثر ڈالا۔ اگر حالی نے ادب کے سماجی مقصد اور اس کی اہمیت پر زور دیا اور اردو والوں کو مغربی تصوّرات سے روشناس کرایا تو شبلی نے ادب کی خالص ادبی خوب صورتیوں پر زیادہ زور دیا۔ نئے زمانے کے کچھ خیالات سے بھی انھوں نے استفادہ کیا، لیکن ان کی بنیادی بات یہ تھی کہ ادب کا اپنا ہی حسن ہوتا ہے۔ خود ان کی نثر اس قدر خوب صورت اور مہذّب ہے کہ ان کی تحریر پڑھ کر ادب کی خوب صورتی کا مطلب آپ ہی آپ واضح ہوجاتا ہے۔

جو اقتباس اس وقت ہمارے سامنے ہے وہ شبلی کی مشہور کتاب "موازنۂ انیس و دبیر" (1907) سے لیا گیا ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے دو بڑے مرثیہ گویوں یعنی انیس اور دبیر کے شاعرانہ مرتبے سے بحث کی ہے۔ جگہ جگہ فنِ شاعری کے بارے میں بھی بہت سی کارآمد اور خیال افروز باتیں بیان کی ہیں۔

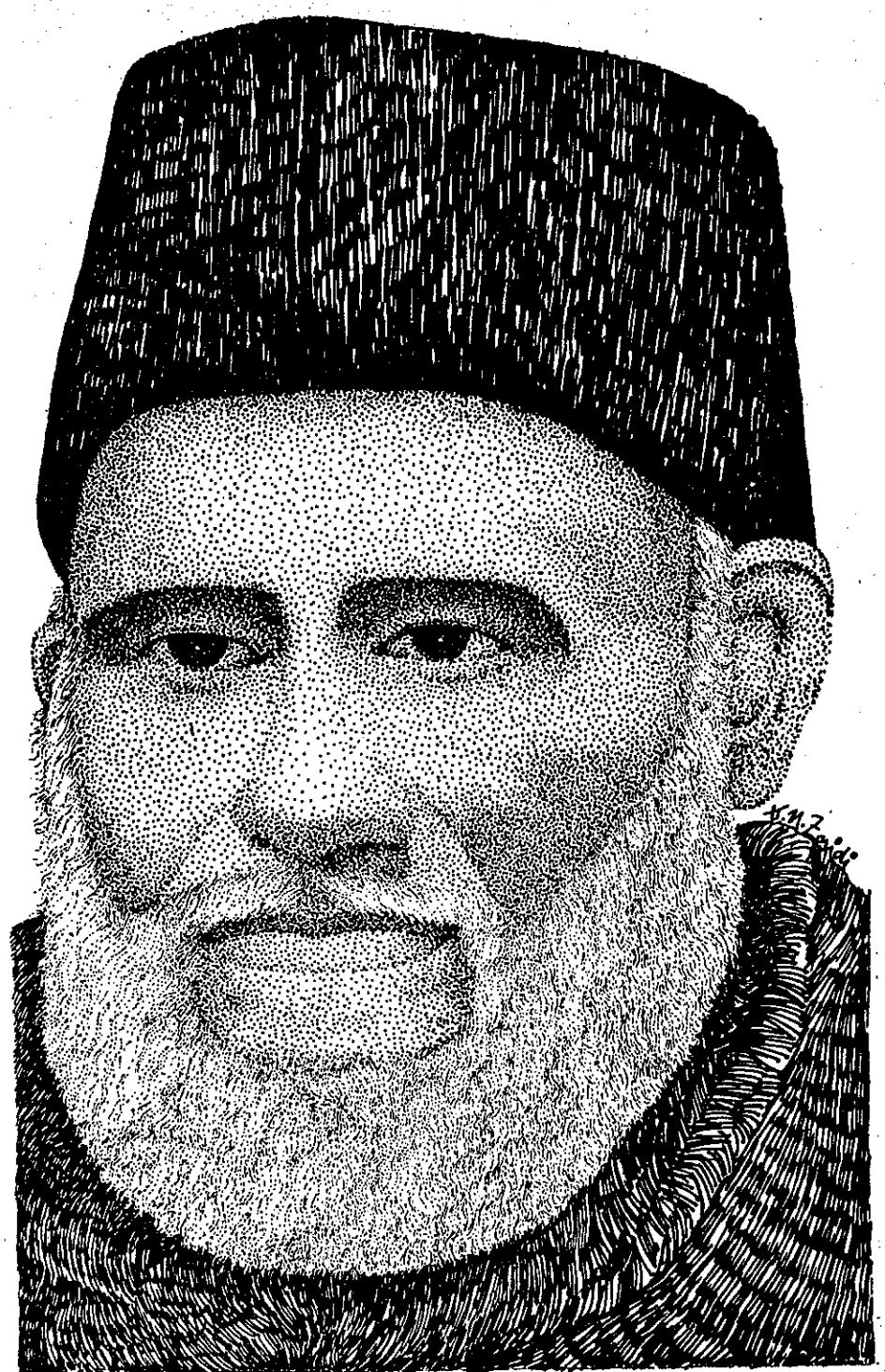

استعارات وتشبیہات

یہ چیزیں حُسنِ کلام کا زیور ہیں بلکہ سچ یہ ہے کہ نظم ونثر اور تقریر وتحریر میں جو کچھ جادوگری ہے، بہت کچھ اِنھیں کی بدولت ہے۔ لیکن جس طرح ہر چیز جب تک نیچرل حالت میں رہتی ہے، اُس کا اصلی حُسن قائم رہتا ہے۔ جب تکلّف اور تصنّع شروع ہوتا ہے، تو اثر میں کمی آجاتی ہے۔ اسی طرح تشبیہ اور استعارے میں بھی جب بہ قصد و تکلّف، غرابت اور غیر معمولی نُدرت پیدا کی جاتی ہے، تو اصل اثر جاتا رہتا ہے۔

اُردو کی شاعری میں جس طرح اور بہت سے بے معنی تکلّفات پیدا ہوگئے، جنھوں نے شاعری کا اصل جوہر خاک میں ملا دیا ہے، اُسی طرح تشبیہات اور استعارات کی حالت بھی بالکل بدل گئی ہے، اور لُطف یہ کہ آج کل کے اہلِ سخن، بد مذاقی سے، اسی کو کمالِ سخن سمجھتے ہیں۔

انسان میں فطرۃً یہ بات پیدا کی گئی ہے کہ وہ اشیا کی تصویر سے لُطف اٹھاتا ہے۔ ایک بدصورت حبشی ہمارے سامنے آئے تو ہم کو نفرت ہوگی، لیکن اگر کوئی ہو بہو اُس کی تصویر کھینچ دے تو ہم کو لُطف آئے گا، اور جس قدر وہ زیادہ اصل کے مطابق ہوگی، اُسی قدر طبیعت پر لطف اور استعجاب

کا زیادہ اثر ہوگا۔ چونکہ تشبیہ بھی ایک قسم کی تصویر ہے، اس لیے طبیعت کا اس سے محظوظ اور مُتلذّذ ہونا ایک فطرتی امر ہے۔

تشبیہ کی دو قسمیں ہیں: مُفرد، مُرکّب۔

مفرد: جس طرح چہرے کو پھول سے تشبیہ دی جائے۔

مرکّب: جس طرح کہا جائے کہ میدانِ جنگ میں گرد اُٹھی تو اُس میں تلواریں اس طرح چمکتی تھیں، جس طرح شب کو ستارے ٹوٹتے ہیں۔

"مفرد تشبیہ" میں چنداں جدّت نہیں ہوسکتی۔ اوّلاً تو اس وجہ سے کہ مفرد چیزوں کی طرف ہر شخص کا خیال منتقل ہوسکتا ہے، ثانیاً، مدّت سے شعرا اور اہلِ قلم اِس قسم کی تشبیہ سے کام لے رہے ہیں، اس لیے عالمِ قدرت میں جو چیزیں تشبیہ کے قابل تھیں، اکثر کام میں آچکیں۔ مثلاً چہرے کو پھول، آفتاب، مہتاب، آئینے، سے تشبیہ دے سکتے تھے، سو، سو سو دفعہ دے چکے، اب عالمِ فطرت میں کوئی نئی چیز پیدا ہو تو چہرے کی تشبیہ میں بھی جدّت پیدا ہو۔

البتہ "مرکّب تشبیہ" میں ہر وقت جدّت پیدا ہوسکتی ہے، کیونکہ اوّل تو ترکیب کی ہزاروں صورتیں ہیں، دوسرے یہ کہ چند اشیا کی ترکیب سے جو مجموعی ہیئت پیدا ہوتی ہے، اُس کی طرف ہر شخص کا خیال نہیں منتقل ہوسکتا۔

ایک نُکتہ اور سمجھ لینے کے قابل ہے: تشبیہ کی اصل خوبی یہ ہے کہ مُشبّہ کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے۔ اور نیچرل شاعری میں، جیسا کہ قُدمائے عرب کی شاعری تھی، تمام تشبیہیں اِسی قسم کی ہوتی تھیں، لیکن ایک مدّت سے ایشیائی شاعری، نیچرل حالت سے دور پڑ گئی ہے، اس لیے آج اِس قسم کی تشبیہات کا ڈھونڈنا بے فائدہ ہے، تاہم تشبیہ کی خوبیاں جس قدر میر انیس

کے کلام میں پائی جاتی ہیں، اُردو زبان میں اُن کی نظیر نہیں مل سکتی۔ اُن کی تشبیہات میں جو خصوصیات ہیں، اُن کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

(1) اکثر تشبیہات مرکّب ہیں۔

(2) اکثر تشبیہات قریبُ الفہم، اور سریعُ الانتقال اِلی الذّہن ہیں، اور یہی تشبیہ کا بڑا کمال ہے۔

(3) علمائے معانی نے لکھا ہے کہ تشبیہ کی غرض کبھی مُشبّہ کی رفعت اور حُسن، اور کبھی تحقیر اور ذلّت، اور کبھی رعب و ہیبت ہوتی ہے، یہ باتیں میر انیس کی تشبیہات میں کمال کے درجے پر پائی جاتی ہیں۔ مثلاً حضرت عبّاسؓ پر جب ہر طرف سے برچھیاں چلنے لگی ہیں تو اِس حالت کو اس طرح ظاہر کیا ہے:

یوں برچھیاں تھیں چار طرف اُس جناب کے
جیسے کرن نکلتی ہے گرد آفتاب کے

برچھیوں سے زخمی ہونا، شکست اور مغلوبیت کی حالت ہے، اس لیے اُس کے بیان کرنے سے ذلّت کا خیال پیدا ہوتا ہے، لیکن اِس تشبیہ نے حالت بدل دی۔

یا مثلاً جب حضرت عبّاسؓ کے دونوں ہاتھ تلوار سے کٹ کر گر پڑے اور اُنھوں نے مَشک کو دانتوں سے پکڑ لیا، تو اُس حالت کی تصویر اس طرح کھینچی ہے:

مَشکیزہ تھا کہ شیر کے مُنھ میں شکار تھا

مشکیزے کا مُنھ میں لینا ایک بدنما صورت ہے، لیکن اِس تشبیہ نے بدنمائی کے بجائے شان پیدا کر دی۔

یا مثلاً جب تمام اہلِ بیت ایک ہی رسّی میں قید کیے گئے ہیں تو اُس

حالت کو اس طرح بیان کیا ہے ؎

گردنیں بارہ اسیروں کی ہیں اور ایک رسن
جس طرح رشتہ، گلدستہ میں گل ہائے چمن

رسّی میں باندھا جانا اور وہ بھی ایک ہی رسّی میں، بہ ظاہر نہایت ذلّت نما حالت تھی، لیکن تشبیہ نے بدنمائی کو حُسن سے بدل دیا۔

یا مثلاً یہ شعر ؎

مَقتل میں کیا ہجوم تھا اُس نورِ عین پر
پروانے گر رہے تھے چراغِ حُسین پر

یا مثلاً اِن اشعار میں تشبیہ سے دشمن کی ہیبت اور بدنمائی پیدا کی ہے ؎

کہتی تھی یہ زِرہ بدنِ بدخِصال میں — پکڑا ہے پیلِ مست کو لوہے کے جال میں
گھوڑے پہ تھا شقی کہ پہاڑی پہ دیو تھا
سینے کے تھے کواڑ کہ خیبر کا بند باب — تنّورِ گرم تھا شکمِ خانماں خراب

جوشِ غضب سے سُرخ ہوئی چشمِ نابکار — مثلِ تنور مُنھ سے نکلنے لگا بُخار

(4) محسوسات سے جو تشبیہ دی جاتی ہے، نہایت عمدہ خیال کی جاتی ہے، کیونکہ محسوسات، رات دن محسوس ہوتے رہتے ہیں، اس لیے اُن کے ذکر کے ساتھ فوراً اُن کی صورت ذہن میں آجاتی ہے اور اس لیے مشبّہ کی تصویر بھی آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ اس قسم کی تشبیہات میر انیس کے ہاں کثرت سے ہیں۔ مثلاً بھاگڑ اور اضطراب کا بیان ؎

یوں روح کے طائر، تن و سر چھوڑ کے بھاگے
جیسے کوئی بھونچال میں گھر چھوڑ کے بھاگے

تلوار کی تعریف :

جوشن کو کاٹ جاتی تھی یوں آکے اَوج سے
پیراک جس طرح نکل آتا ہے موج سے

کالی وہ ڈانڈ اور وہ چمکتی ہوئی سِناں
غُل تھا کہ اژدہا ہے نکالے ہوئے زباں

یا مثلاً دو حریف برچھیوں سے ایک دوسرے پر وار کر رہے ہیں اور برچھیوں کی اَنیاں باہم ٹکراتی ہیں :

دو سانپ گُتھ گئے تھے زبانیں نکال کے

اِسی حالت کی ایک اور تشبیہ :

شمعوں کی تھیں لَویں کہ بِلیں اور جُدا ہوئیں

تعزیہ خانے میں لوگوں کا سیاہ ماتمی لباس :

مردم سیاہ پوش ہیں سب ، اور گھر سفید
جیسے بیاضِ چشم اِدھر اور اُدھر سفید

حضرت علی اکبر کا چھوٹا سا نیزہ دشمن کے بھالے سے ٹکراتا ہے :

غُل تھا کہ اژدہے سے وہ اَفعی لپٹ گیا

غیظ اور غضب کی حالت :

یوں غیظ تھا عمر کی طلب سے دلیر کو
جس طرح ٹوک دے کوئی غصّے میں شیر کو

ڈھال پر تلوار کو آسانی سے روک لینا :

یوں روکتے تھے ڈھال پہ تیغِ جھول کو
جس طرح روک لے کوئی شہ زور پھول کو

خزاں کے موسم میں پتّوں کی حالت :

پتّے بہ رنگ چہرۂ مدقوق، زرد تھے

(5) بعض جگہ تشبیہ سے مُبالغہ مقصود ہوتا ہے ، اس قسم کی تشبیہیں میر صاحب کے ہاں نہایت اعلیٰ درجے کی پائی جاتی ہیں ، اگرچہ فی الحقیقت اُن سے تشبیہ کی اصلی غرض نہیں حاصل ہوتی کیونکہ مبالغہ خود ایسی چیز ہے جو اصلیّت سے دور کر دیتی ہے۔

گرمی کی شدّت کا بیان :

گِرداب پر تھا شعلۂ جوّالہ کا گماں
انگارے تھے حُباب، تو پانی شرر فشاں

مُنھ سے نکل پڑی تھی ہر اک موج کی زباں
تہ میں تھے سب نہنگ، مگر تھی لبوں پہ جاں

پانی تھا آگ ، گرمیِ روزِ حساب تھی
ماہی جو سیخِ موج تک آئی، کباب تھی

حسنُ التّعلیل

یہ ایک لطیف صَنعت ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ شاعر یک ایسی چیز کو کسی چیز کی عِلّت فرض کرتا ہے ، جو درحقیقت اُس کی علّت نہیں۔ مثلاً :

بھلائی جو کرے دنیا میں، ہووے وہ پامال
بسانِ جادہ کسی کو تو راہ مت بتلا

"جادہ" یعنی راستہ پامال ہوتا ہے، شاعر اس کی یہ وجہ قرار دیتا ہے کہ راستہ لوگوں سے بھلائی کرتا ہے اس لیے پامال ہے۔ یہ ایک قسم کی تخئیل ہے اور اس لحاظ سے یہ صنعت عینِ شاعری ہے، کیونکہ شاعری درحقیقت تخئیل کا نام ہے۔ اِس صنعت میں اُس وقت زیادہ لطافت پیدا ہوجاتی ہے جب وہ وصف بھی، جس کی علّت بیان کرنی ہے، تخئیل پر مبنی ہو۔ مثلاً میر انیس کا یہ شعر:

ڈر سے ہوا فرات کی موجوں کو اضطراب
اور آب میں سروں کو چُھپانے لگے حُباب

موجوں کے اضطراب اور حباب کے سر چُھپانے کی علّت، ڈر اور خوف کو قرار دیا ہے۔ لیکن موج کا اضطراب اور حباب کا پانی میں سر چُھپانا، خود کوئی واقعی چیز نہیں، بلکہ شاعر نے موج کی حرکت کو اضطراب قرار دیا ہے اور حباب جو ٹوٹ جاتا ہے، تو اُس کو فرض کیا ہے کہ اُس نے پانی میں مُنھ چھپالیا۔ اِس صنعت کو میر انیس نے اکثر جگہ نہایت خوبی سے برتا ہے۔

معنی اور اشارے

بہ قصد و تکلّف = پہلے سے ارادہ کرکے اور بناوٹ کے ساتھ۔

غرابت = اجنبیّت، ناپسندیدہ انوکھا پن، یہ لفظ "غریب" سے بنا ہے جس کے اصلی معنی ہیں: اجنبی۔

مُتلذّذ ہونا = لذّت حاصل ہونا

مشبّہ = وہ چیز جس کو بیان کرنے کے لیے تشبیہ دی جائے، مثلاً اگر چہرے کو پھول کہیں تو چہرہ "مشبّہ" ہے۔

نظیر = مثال، یعنی کسی چیز کی طرح کی کوئی اور چیز۔ "نذیر" ایک دوسرا لفظ ہے، اس کے معنی ہیں "ڈرانے والا"۔

سریعُ الانتقال الی الذّہن = جو چیز ذہن تک جلدی سے پہنچ جائے۔

علمائے معانی = علمِ معانی یا معنی کے جاننے والے۔ "معنی" وہ علم ہے جس میں شعر کی خوبیوں سے بحث کی جاتی ہے۔

بیاضِ چشم = آنکھ کا سفید حصّہ

قُدما = بہت پرانے شاعر۔ یہ لفظ "قدیم" کی جمع ہے جس کے معنی ہیں: پرانا

غُلو = زیادتی، کثرت

مضمون بندی = کلام میں ایسی باتیں کہنے کا لحاظ رکھنا جو عام طور پر نہ کہی گئی ہوں۔

تعلیل = وجہ قائم کرنا

علّت = وجہ

غور کرنے کی بات

جب کسی چیز کے بارے میں کہا جائے کہ وہ کسی اور چیز کی طرح ہے تو اسے "تشبیہ" کہتے ہیں۔ تشبیہ میں عام طور پر یہ بات ظاہر کر دی جاتی ہے کہ کوئی چیز کسی دوسری چیز کی طرح کیونکر ہے۔ "استعارے" میں بھی یہی ہوتا ہے کہ کسی چیز کو کسی اور چیز کی طرح یا اس کے برابر بتایا جاتا ہے لیکن تشبیہ کے برخلاف استعارے میں یہ بات واضح نہیں کی جاتی کہ کوئی چیز کسی دوسری چیز کی طرح یا برابر کیوں ہے۔

اقتباس نمبر ایک :

شبلی کہتے ہیں کہ اگر تشبیہ اور استعارے میں جان بوجھ کر اور بناوٹ کے ساتھ نیاپن پیدا کیا جائے تو خوب صورتی جاتی رہتی ہے۔ شبلی کا یہ خیال اس زمانے کے فیشن کے مطابق ہے۔ ورنہ اصل بات یہ ہے کہ تشبیہ اور استعارے کی خوبی ان کے نئے پن ہی میں ہے۔ یہ بات شبلی نے خود آگے چل کر مرکب تشبیہوں کے سلسلے میں بیان کی ہے۔ شبلی نے یہ بھی بتادیا ہے کہ تشبیہ اور استعارے کے ذریعے اصل معاملے کی ایک تصویر ذہن میں آجاتی ہے لہٰذا جس تشبیہ اور استعارے کے ذریعے تصویر بہ خوبی نہ بن سکے اسی کو بے اثر یا ناکام کہا جائے گا۔

"محسوس سے جو تشبیہ دی جاتی ہے" سے شبلی کی مراد ہے کہ وہ تشبیہیں جو دیکھنے، چھونے، سُننے، چکھنے یا سونگھنے کی صلاحیتوں میں سے کسی ایک یا زیادہ کو متحرک کرتی ہوں۔ یہ عمل تشبیہ کے علاوہ استعارے کے ذریعے بھی

ہوسکتا ہے اور ایسے الفاظ کے ذریعے بھی ہوسکتا ہے جن میں براہ راست تشبیہ یا استعارہ نہ ہو لیکن ان صلاحیتوں کو متحرک کرنے کی قوت ہو۔ مثلاً : جی سنسنانا یا میٹھا زہر اس طرح کے الفاظ کو "پیکر" کہتے ہیں۔ میر انیس اور دوسرے بڑے شاعروں کے یہاں تشبیہ اور استعارہ اور پیکر کبھی کبھی ایک ساتھ کام کرتے ہوئے نظر آتے ہیں بتائیے کہ مندرجہ ذیل شعر میں یہ تینوں کس طرح کارفرما ہیں ؎

یوں روح کے طائر تن و سر چھوڑ کے بھاگے
جیسے کوئی بھونچال میں گھر چھوڑ کے بھاگے

"مبالغہ" بھی ایک صنعت یعنی خوبی ہے۔ اس کے معنی ہیں کسی بات کو بڑھا کر بیان کرنا۔ شبلی نے صحیح لکھا ہے کہ بعض جگہ تشبیہ کے ذریعے مبالغہ پیدا ہوتا ہے۔ یہی بات استعارے کے بارے میں بھی کہی گئی ہے۔ غور سے دیکھیے تو کسی کی بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کیے بغیر تشبیہ یا استعارے کا مقصد پوری طرح حاصل نہیں ہوتا۔ مثلاً اگر ہم نے کہا کہ فلاں شخص شیر کی طرح بہادر ہے تو یہ تشبیہ ہوئی اور اگر ہم نے یہ کہا کہ فلاں شخص شیر ہے تو یہ استعارہ ہوا۔ دونوں صورتوں میں مبالغہ موجود ہے۔ لہٰذا شبلی کا یہ کہنا پوری طرح صحیح نہیں کہ مبالغہ ایسی چیز ہے جو اصلیت سے دور کر دیتی ہے۔

بعض لوگوں نے مبالغے کی کئی قسمیں بیان کی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ کسی بات کو اتنا بڑھا کر بیان کرنا کہ ویسی بات روزمرّہ کے حالات میں ممکن نہ ہو، چاہے عقل کے اعتبار سے ممکن ہو، اس کو "اِغراق" کہتے ہیں اور بات کو اتنا بڑھانا کہ وہ عملاً ممکن ہو نہ عقلاً تو اسے "غُلو" کہتے ہیں۔ ان لوگوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ مبالغہ تو ٹھیک ہے، اِغراق بھی ایک حد تک ٹھیک ہے لیکن غُلو

ٹھیک نہیں۔ غور سے سوچیں تو معلوم ہوتا ہے کہ مبالغے کی یہ تقسیم ہر جگہ کام نہ آئے گی کیونکہ "فلاں شخص شیر کی طرح بہادر ہے"۔ اس میں غُلو بھی ہے اور اغراق بھی لیکن پھر بھی اس مبالغے کو ناپسندیدہ نہیں کہہ سکتے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ اپنے موقعے محل کے اعتبار سے مبالغہ اچھا ہی ہوتا ہے۔

اقتباس نمبر دو:

شبلی نے "حسن التّعلیل" لکھا ہے لیکن اردو میں عام طور پر "حسنِ تعلیل" کہتے ہیں۔ ذیل میں میر انیسؔ کے کچھ اشعار درج ہیں۔ کسی میں "ایہام" ہے اور کسی میں حسنِ تعلیل۔ ان کی نشان دہی کیجیے اور بتائیے کہ ان شعروں میں ایہام یا حسنِ تعلیل کس طرح ہے؟

تعریف میں چشمے کو سمندر سے ملا دوں — قطرے کو جو دوں آب تو گوہر سے ملا دوں

______

پیاسی جو تھی سپاہِ خدا تین رات کی — ساحل سے سر پٹکتی تھیں موجیں فرات کی

______

اللہ رے فرقِ گردن و سر بھی بہم نہ تھے — کُشتوں کا ذکر کیا ہے کہ تیغوں میں دَم نہ تھے

(فرق = سر دم = خون) ______

جو گھاٹ پر تھا خون میں وہ شور بور تھا — سارا یہ تیغِ تیز کے پانی کا شور تھا

______

لہر وہ سبز پھریرے کی وہ پنجے کی چمک — شرم سے ابر میں چھپ جاتا تھا خورشیدِ فلک

______

اس سبق میں ہم نے تشبیہ، استعارہ، مبالغہ اور حسنِ تعلیل کے بارے میں کچھ پڑھا ہے۔ ان تمام چیزوں کو "صنعت" (جمع صنائع) کہاجاتا ہے۔ جس صنعت کا تعلق معنی سے زیادہ ہوتا ہے اور لفظ کی ظاہری شکل سے کم، اس کو "معنوی" کہتے ہیں اور جس صنعت کا تعلق لفظ کی ظاہری شکل سے ہوتا ہے اس کو "لفظی" کہتے ہیں۔

ان تمام چیزوں کو ملا کر "صنائع بدائع" بھی کہاجاتا ہے۔ صنائع بدائع اردو شاعری کی بہت بڑی خوبی ہیں۔ ذیل میں ہم ایک اور صنعت کا ذکر کرتے ہیں:

"مُراعاتُ النّظیر": اس کے معنی ہیں ملتی جُلتی چیزوں کی رعایت کرنا۔ یہ صنعت تمام اچھے شاعروں کے یہاں کثرت سے نظر آتی ہے۔ جب کسی شعر میں معنی کے لحاظ سے کئی لفظ آپس میں ملتے جلتے ہوں تو اس حالت کو "مُراعاتُ النّظیر" کا اصطلاحی نام دیتے ہیں ورنہ عام طور پر اسے صرف "رعایت" یا "مناسبت" کہاجاتا ہے۔ مُراعاتُ النّظیر یا رعایت کا لطف اس وقت زیادہ ہوجاتا ہے جب الفاظ بالکل سامنے کے نہ ہوں۔ مثلاً "بُت" کے ساتھ "خدا" یا "وفا" کے ساتھ "جفا" یا "شمع" کے ساتھ "پروانہ" کہنے میں کوئی لطف نہیں ہے۔ مراعاتُ النّظیر کا کچھ ذکر سوداؔ کی غزلوں کے ساتھ بھی ہے۔ اس کو بھی پڑھ لیجیے۔

مندرجہ ذیل اشعار میں مراعاتُ النّظیر کی نشان دہی کیجیے:

گھٹا چھا گئی ڈھالوں سے سیہ کاروں کی — برق ہر صف میں چمکنے لگی تلواروں کی

(میر انیسؔ) ______

ہماری خاک پہ اک بے کسی برستی ہے — ادھر سے ابر جب آیا تب اشک بار ہوا

(میرؔ) ______

وہ گہر آنکھ سے جاوے تو تھمے آنسو میرؔ — اتنا رویا ہوں کہ ہوں تا بہ کمر پانی میں

(میرؔ) ______

سینے کا داغ ہے وہ نالہ کہ لب تک نہ گیا — خاک کا رزق ہے وہ قطرہ کہ دریا نہ ہوا

(غالبؔ) ______